ڈاکٹر اسرار احمدؒ — فعّال شخصیت

پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر☆

ہم نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو بعض دفعہ بہت قریب سے اور بہت دفعہ قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے ساتھ بعض مواقع پر تبادلۂ خیال بھی کیا۔ لوگ ان کو محض ایک عالم دین ہی خیال کرتے رہے۔ وہ کسی مدرسے سے نہیں بلکہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ علمِ طب کی تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد انہوں نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ سے ایم اے اسلامیات کی ڈگری بھی حاصل کی۔ انہوں نے اپنا کلینک بھی بنایا' پریکٹس کی' لیکن اپنے طبعی میلان کے تحت دین کی اشاعت وتبلیغ کو زندگی کا ہدف قرار دیا اور جسمانی امراض کے علاج کے ساتھ ساتھ روحانی بیماریوں کے علاج کی طرف زیادہ توجہ دی۔ ان کا یہ ہدف ان کی زندگی پر اتنا غالب آیا کہ لوگ ان کو ایم بی بی ایس ڈاکٹر سمجھنے کی بجائے اسلامی علوم کا ڈاکٹر ہی خیال کرنے لگے۔

یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے' انہوں نے کرشن نگر کے علاقہ میں اپنا کلینک قائم کیا تھا۔ ہمارے ایک دوست شیخ سعید صاحب ایم بی بی ایس کے طالب علم تھے۔ ہم دونوں اُن سے ملنے اُن کے مطب گئے۔ اُس وقت ڈاکٹر اسرار صاحب کا عنفوانِ شباب تھا اور وہ جماعت اسلامی سے تازہ تازہ علیحدہ ہوئے تھے اور کچھ کر گزرنے کی ذہنی کشمکش میں تھے۔ اسی دوران ہماری ملاقات ان سے ہوئی۔ پہلی ملاقات تھی' وہ ہمیں جانتے نہ تھے' ہم نے بھی صرف ان کا نام ہی سن رکھا تھا' اس لیے ملاقات میں بہت زیادہ گرمجوشی نہ تھی۔ ان کے دیکھنے کا انداز بڑا بارعب تھا' جس کی وجہ سے اس ملاقات میں اپنائیت بھی پیدا نہ ہو سکی۔ تاہم یہ محسوس ہوا کہ وہ دینی درد رکھنے والے انسان ہیں اور دین کو غالب کرنے اور دین کو غالب دیکھنے کی تمنّا ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بھرپور زندگی گزاری۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو اللہ کی امانت خیال کیا اور پوری زندگی میں لمحہ بھر کے لیے بھی بیکار نہ بیٹھے۔ ہر لمحے کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے یا اعلائے کلمۃ اللہ کی سوچ کے لیے وقف رکھا۔ اپنی اولاد تک میں اس فکر کو اس طرح سمو دیا جس طرح ڈاکٹر انجکشن کے ذریعے دوائی کا ایک ایک قطرہ مریض کے جسم میں داخل کر دیتا ہے۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے لیکن انہوں نے قوم کے جسمانی علاج کی بجائے روحانی علاج کی جانب زیادہ توجہ دی۔ کیونکہ روحانی بیماریاں قوم کو فکری فالج میں مبتلا کرتی ہیں' جس سے قوموں کی اجتماعی فکری ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے۔ عام جسمانی امراض کا اثر زیادہ نہیں ہوتا اور جسمانی امراض سے اموات کا دائرہ بھی محدود رہتا ہے' جبکہ فکری ہلاکت

☆ مدیر ماہنامہ التجوید' فیصل آباد

پوری قوم بلکہ نسلوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب شروع ہی سے تحریکی ذہن رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ شعور کی آنکھ کھولی تو پورے ہندوستان میں آزادی کی تحریکوں کا زور دیکھا۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے الگ مملکت کے قیام کے لیے سرگرم عمل تھی، جس کے سربراہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد ان کی فکر سے متاثر ہوئے اور مسلمان طلبہ کی تنظیم مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہوئے اور تحریک پاکستان کے لیے کام شروع کیا۔ ملک میں دیگر تحریکیں بھی آزادی کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ قرائن بتاتے ہیں کہ ان کا ذہن ان تحریکوں سے بھی متاثر ہوا۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ ''مقصد تشکیل پاکستان'' کے لیے سرگرم عمل ہوئے اور ملک میں اسلامی نظام کے قیام کو زندگی کا ہدف قرار دیا۔ اس حوالے سے وہ مولانا مودودیؒ کے قریب ہوئے۔ یہ زمانہ چونکہ طالب علمی کا تھا' اس لیے وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم رکن بن گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے باقاعدہ جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کی۔ ان کی طبیعت میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ جس بات کو درست خیال کرتے اس کا برملا اظہار کرتے۔ لکیر کی فقیری کرتے ہوئے آگے بڑھنا ان کی زندگی میں نہ تھا۔ جماعت اسلامی نے جب اجتماعی طور پر جمہوری انتخابی سیاست میں قدم رکھنے اور مغربی جمہوریت کے ذریعے حکومت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر اسرار احمد نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کے نزدیک یہ جمہوری نظامِ سیاست' اسلامی نظامِ سیاست سے مختلف تھا۔ انہوں نے جماعت اسلامی کے حلقوں میں اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا۔ جب دیکھا کہ ان کی بات وہاں بے وزن ہے تو انہوں نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ذہن چونکہ تحریکی تھا' اس لیے اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے تنظیم اسلامی کے نام سے نئی جماعت کی بنیاد ڈالی۔

ڈاکٹر صاحب فکری اعتبار سے دیوبندی مسلک کے قریب تھے۔ ان کا ضمیر علمائے دیوبند کی فکر سے ہم آہنگ تھا لیکن طبیعت کے اندر فکری تنوع اور جولانی موجود تھی۔ انہوں نے اپنی سوچ کو جمود کا شکار کبھی نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رفع یدین کے قائل اور فاعل بھی ہوئے۔ تاہم دیوبندی علماء کے سرخیل استاذ الاستاذہ مولانا محمود حسنؒ کی فکر ان کے ذہن کا حصہ تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کو شریفِ مکہ نے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کیا۔ آپ پر مصر میں مقدمہ چلا اور آپ کو بغاوت کے جرم میں مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ تقریباً تین برس قید کی سزا ہوئی۔ اس دوران وہ مسلمانوں کی نکبت و ادبار کے اسباب پر غور کرتے رہے اور ان کی بہتری اور اصلاح احوال کے ذرائع سوچتے رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے ادبار کا بڑا سبب قرآنی فہم سے دوری ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی بقیہ ساری زندگی قرآنی فہم کو عام کرنے میں صرف کر دی اور دہلی اور مضافات میں جگہ جگہ دروسِ قرآنی کے حلقے قائم کیے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اسی فکر کے امین تھے۔ ان کا خیال بھی یہی تھا کہ قرآن فہمی کے حلقے زیادہ سے زیادہ قائم کیے جائیں۔ اس کے لیے انہوں نے رجوع الی القرآن کی تحریک جاری کی اور دروسِ قرآن کے سلاسل کی بنا ڈالی۔ لاہور کے قرب و جوار میں خود دروسِ قرآن دیتے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے دروس کی بنیاد پر ایسے شاگرد پیدا کر لیے جو خود درسِ قرآن کی صلاحیت کے حامل تھے۔ ایسے افراد کو انہوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں دروسِ قرآن کی ذمہ داریاں سونپیں۔ ان کی کوشش ہی سے تنظیم اسلامی کی شاخیں

پاکستان کے مختلف شہروں میں بھی قائم ہوئیں۔ ان شاخوں نے مثبت خدمات انجام دیں اور دے رہی ہیں۔

جماعت اسلامی کا ایک المیہ یہ ہے کہ یہ جماعت بڑی محنت سے محرک اور متحرک رجال تیار کرتی ہے۔ جماعت کی تربیت ہی سے ان میں کچھ کرنے اور کچھ کر گزرنے کے جذبات جنم لیتے ہیں اور ان کے اندر تحریکی صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن جانے کیا وجہ ہے کہ اس کاشت کا پھل جماعت اسلامی کو کبھی نہیں ملا اور بیشتر اذہان ایسے عالم میں جماعت کو خیرباد کہہ گئے جب پھل پک کر جھولی میں گرنے ہی والا ہوا تھا۔ اس طرح جماعت اپنی محنت کا پھل لینے سے محروم ہی رہی۔ ماچھی گوٹھ کا اجتماع اس کی بنیاد ہے، جس میں بڑے بڑے اکابر نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی۔ پھر بعد میں بھی بہت سے لوگ علیحدہ ہوئے۔ مثلاً مولانا کوثر نیازی مرحوم نے تربیت تو مولانا مودودیؒ سے حاصل کی اور اس کا پھل پاکستان پیپلز پارٹی کے حصہ میں آیا۔ ان کی ساری صلاحیتوں کا فائدہ سیکولر نظام کی داعی پیپلز پارٹی نے اٹھایا۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر پیپلز پارٹی کو مولانا کوثر نیازی جیسے باصلاحیت شخص کا کندھا نہ ملتا تو پیپلز پارٹی کبھی وہ مقام حاصل نہ کر پاتی جو اس کو مولانا کی وجہ سے مذہبی طبقے میں حاصل ہوا۔ بعض لوگ راوی ہیں کہ جب مولانا کوثر نیازی پیپلز پارٹی کے ہم سفر ہوئے تو کسی نے مولانا مودودیؒ سے کہا: ''مولانا کوثر نیازی آپ کے پروردہ تھے۔ ان کی شخصیت سازی میں آپ کا حصہ ہے، جب ان سے کام لینے کا وقت آیا تو وہ آپ کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی میں چلے گئے۔ آپ کی تربیت میں کمی تھی یا ان کا ظرف چھوٹا تھا؟'' بڑے لوگوں کی بڑی باتیں، مولانا نے بات سنی تو بولے: ''کوثر نیازی کو ہم نے چیتھڑا سمجھ کر پھینکا تھا، انہوں نے عمامہ بنا لیا''۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

اختلافِ فطرت کا حصہ ہے۔ مولانا کوثر نیازی جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تو منزل چھوڑ، نشانِ منزل کو بھی بھلا بیٹھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تو ہدف کو نہ بھولے، منزل کو سامنے رکھا، نشانِ منزل سے بھی نہ بھٹکے اور ایسی جماعت چھوڑ گئے جو ان کے مشن کو جاری رکھنے کا عزم لیے ہوئے ہے آج نہیں تو کل منزل تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی جائے گی۔

اتباعِ سنت کا اہتمام عمر بھر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا حصہ رہا۔ دین کے غلبہ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا داعیہ ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ وہ اسی کے لیے زندہ رہے اور زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اپنے اس مشن کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اپنی زندگی کی آخری رات بھی آخری پہر تک دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہے اور جانِ جاں آفریں کے سپرد کر دی ع ''کسی کو خبر نہ ہوئی کون تھا کہاں چلا گیا!'' اور وہاں چلے گئے جہاں سب نے جانا ہے، جا کر واپس نہیں آنا۔ لیکن ڈاکٹر اسرار احمد کا جانا کسی ایک کا جانا نہیں، پوری قوم کا مردہ ہو جانا ہے۔ موت اگر گھر کے آنگن میں آئے تو ایک ہی مرتا ہے لیکن اگر کسی نابغہ روزگار کے دروازے پر دستک دے تو ایک نہیں پوری قوم کا جنازہ اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے لیے نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے جیتے تھے۔ ان کی زندگی علامہ اقبال کے اس شعر کا مرقع تھی ؎

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومیؒ کبھی پیچ و تابِ رازیؒ!

ڈاکٹر اسرار احمد کی پون صدی پر محیط زندگی کا جب ہم مجموعی جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ ایک آدمی نہیں بلکہ پوری اکادی تھے۔ کئی لوگ مل کر بھی وہ کام نہیں کر سکتے جیسا اس اکیلے شخص نے سرانجام دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ اللہ کی عطا کردہ حیاتِ مستعار اللہ ہی کے راستہ میں کام آئے۔ ان کا قرب رکھنے والے شاہد ہیں کہ وہ اپنی تقریر کے آغاز میں یا کسی تقریب کے اختتام پر یہ دعا ضرور کرتے تھے: ''اے اللہ! تو مجھے اپنے راستے میں شہادت کی موت عطا کر۔''

ہم جب بھی ان سے ملے' انہیں ہمیشہ دین کے لیے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتا پایا۔ اس کے لیے انہوں نے ایسی شخصیتوں سے رابطے قائم کیے جو اسی فکر کی حامل تھیں۔ وہ اقبال سے متاثر تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں فکرِ اقبال کا غلبہ ان کے ذہن پر مستولی تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی زندگی کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے معاملے میں کبھی سمجھوتہ کے قائل نہ ہوئے۔ جس بات کو حق سمجھا' برملا کہا۔ نتائج کی بھی پروا نہ کی۔ جس بات کو غلط خیال کیا' ہر چہ باداباد اس کا اظہار بھی علی الاعلان کیا۔ محرم کے مہینہ میں شادی بیاہ ایک طبقہ کے نزدیک درست نہیں۔ ان کی رو میں کچھ اہل السنّت نے بھی یہی روش اختیار کرنا شروع کی اور محرم میں شادی کو عملاً برا خیال کرنے لگے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا یہ تھا کہ جس بات کی سند کتاب وسنت میں نہ ملے' اس کا رواج چہ معنی؟ وہ اس بات کو غلط سمجھتے تھے کہ محرم میں شادی بیاہ کو حرام خیال کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کی شادی محرم ہی میں کی اور مثال قائم کی کہ جو کچھ کتاب وسنت میں نہیں وہ شریعت نہیں اور اس کو اعتقادات کا حصہ بنانا بداعتقادی ہے۔ اس پر انہیں قتل کی دھمکیاں بھی ملیں مگر انہوں نے ان دھمکیوں کو برپشمِ قلندر کہہ کر اس طرح نظرانداز کر دیا جس طرح کوئی قلم کار ردّی کاغذ کی تحریر کو ردّی کی ٹوکری میں پھینکتا ہے۔

ایک مرتبہ کرکٹ کے کھیل کو انہوں نے خلافِ شریعت کہا۔ بڑے بڑے قلم کاروں نے قلم کاریاں کیں حتیٰ کہ لتے تک لیے۔ ایک بڑے قلم کار نے ان کے خلاف مضمون لکھا' عنوان باندھا: ''دین ملا فی سبیل اللہ فساد''۔ اُس نے کہی ان کہی سب کہی۔ ڈاکٹر صاحب نے السکوت سلامۃ کی روش اپنائی اور ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ (الفرقان) پر عمل کیا۔

وہ نظامِ خلافت کے علمبردار تھے اور جہاد پر بیعت لیتے تھے۔ وہ فکرِ اصلاحی سے بھی متاثر ہوئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے بہت قریب کا تعلق قائم ہوا۔ ان کے توسط سے فکرِ فراہی کو سمجھا' پرکھا۔ مولانا اصلاحی سے اختلاف بھی کیا' موافقت بھی رکھی۔ جہاں اختلاف ہوا' بھرپور اظہار کیا۔ اس اختلاف سے کبھی کبھی مولانا طبعاً چیں بجبیں ہوئے۔ یہ چیں بجبینی سیخ پائی تک بھی پہنچ جاتی' جس کا اظہار کبھی قلم سے بھی کرتے۔ ایک مرتبہ تو یہاں تک کہہ بیٹھے کہ لڑکا دین میں کوئی نیا گل کھلائے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ مولانا کے مقام ومرتبہ کا خیال کیا۔ اظہارِ اختلاف کے لیے کبھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ڈاکٹر اسرار کی طبیعت جلالی تھی۔ آنکھیں بارعب تھیں۔ دیکھنے والے کے لیے تاب لانا مشکل ہوتا۔ آواز

میں گرج اور دبدبہ تھا۔ دین کے غلبہ کے حوالے سے بات کرتے تو یہ دبدبہ دوبالا ہو جاتا۔ اپنی بات کو پورے اعتماد سے کرتے کہ سننے والا فوراً متاثر ہوتا تھا۔

اتباعِ سنّت کا اہتمام بہت زیادہ کرتے۔ اسی جذبہ کے تحت متانت وسنجیدگی کا مظاہرہ کرتے۔ کھلکھلا کر نہ ہنستے بلکہ مسکراتے۔ صرف ایک موقع پر میں نے ان کو خوب کھل کر ہنستے دیکھا۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ تقریب میں شریک کوئی شخص بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مرکزیہ مجلس اقبال کا اجلاس لاہور کے کسی ہال میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سٹیج پر بیٹھے تھے' دیگر زعماء بھی موجود تھے۔ معروف ادیب وقلم کار عطاء الحق قاسمی اپنی لکھی تقریر پڑھ رہے تھے۔ سیاق وسباق اب ذہن میں نہیں' انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک بچہ گلی کی نکڑ پر کھڑا رو رہا تھا۔ ایک بزرگ وہاں سے گزرے' ان کو اس بچے پر ترس آیا۔ پاس گئے' پوچھا بیٹا تم کیوں رو رہے ہو؟ بچہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا' میری امّی اور ابّو کا آپس میں سخت جھگڑا ہو رہا ہے۔ بزرگ نے پوچھا' تمہارے ابو کون ہیں؟ بچہ بولا' جھگڑا اسی بات پر تو ہو رہا ہے۔ یہ جملے سنتے ہی سٹیج پر بیٹھے سب اکابر اور جملہ سامعین میں سے کون تھا جو اپنی ہنسی ضبط کر سکتا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی فکر اور سوچ کو قلمی گرفت میں لانے کی بھی کوشش کی۔ ان کی چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں ہیں جو ان کی فکر کی حامل ہیں۔ ان کی نگرانی میں کئی جرائد بھی شائع ہوتے رہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ماہنامہ ''میثاق'' کی ادارت سنبھالی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی سرپرستی میں اس ماہنامے کو مزین کرتے رہے۔ پھر ''حکمتِ قرآن'' جاری کیا جو پہلے ماہنامہ تھا' پھر سہ ماہی ہوا۔ ''ندائے خلافت'' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ان قلمی کاوشوں کے علاوہ ان کے انتہائی بھرپور علمی وفکری مضامین ملک کے بڑے بڑے اخبارات اور جرائد کی زینت بھی بنتے رہے۔ بسا اوقات اہلِ قلم کی طرف سے ان کے لکھے گئے کالموں اور مضامین پر شدید گرفت ہوتی تھی۔ بعض تو ایسی گرفت کرتے کہ شرافت کا دامن بھی چھوٹتا نظر آتا' لیکن ڈاکٹر اسرار احمد ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ!

پر عمل کرتے رہے۔ ان کی تحریریں' ان کی تقریریں ان کے علمی کام مستقل تحقیق کا موضوع ہیں' جو محققین' اہلِ علم اور اہلِ قلم کے منتظر ہیں۔ اس تحقیق وتجسّس سے اُمت مسلمہ اپنے لیے جلا حاصل کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر صاحب علم اور علماء کے شناور تھے۔ قرآن فہمی اور رجوع الی القرآن کے حوالے سے رجال کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تلاش کرتے رہے۔ ان کو اپنے عمل میں شریک کرنے کی کوشش فرماتے۔ ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ اس معاملے میں انہیں اس بات کی پروانہ ہوتی تھی کہ ان کا مدعو علم اور مقام ومرتبہ کی وجہ سے ان سے سبقت لے جائے گا اور ان کی شخصیت اس کے سامنے ثانوی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ انہوں نے اس ضمن میں بہت سے لوگوں کو ساتھ ملایا اور ان کے کندھے سے تحریک کو آگے بڑھانے کا کام لیا۔ رجوع الی القرآن جیسا عظیم مقصد حاصل کرنے میں اپنا کندھا ان کو دیا اور مثبت نتائج حاصل کرنے کی سبیل پیدا کی۔

حافظ احمد یار مرحوم بڑے عالم آدمی تھے۔ علماء جیسا انکسار اور تواضع ان کی زندگی کا حصہ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی شعبہ علوم اسلامیہ میں قرآن کے استاد تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی عقابی نظروں نے ان کے اندر جوہر قابل کو پہچان لیا۔ ان کے قریب ہوئے' انہیں اپنے قریب کیا۔ مزید قریب کرنے کے لیے اپنی تحریک کے مقاصد ان کے سامنے رکھے۔ حافظ صاحب بھی خدمت کا جذبہ رکھنے والے انسان تھے۔ فکری ہم آہنگی کے ہاتھوں مجبور ہوئے اور کندھا دینے کا عہد کیا۔ حافظ صاحب نے علمی کام کے لیے ایک انتہائی اچھوتا موضوع تلاش کیا جو پچھلی چودہ صدیوں میں بالکل ہی منفرد تھا۔ ان کا کام رسم قرآنی کے حوالے سے تھا جس پر ماضی میں کام نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اہلِ علم' علم الرسم سے نابلد رہے۔ حافظ احمد یار کے تحقیقی کام کی اقساط ماہنامہ ''حکمت قرآن'' میں شائع ہوتی رہیں' لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور حافظ احمد یار سورۃ البقرۃ بھی مکمل نہ کر پائے تھے کہ وقتِ اجل آ گیا۔ اگر ڈاکٹر اسرار احمد' حافظ احمد یار مرحوم سے یہ خدمت لینے کی سعی نہ کرتے تو یہ تحقیقی اور علمی کام مستور ہی رہتا۔ شروع میں تو حافظ احمد یار قرآن اکیڈمی میں آتے' کام کرتے اور چھٹی کے وقت گھر چلے جاتے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ پیرانہ سالی کے سبب حافظ احمد یار صاحب کا قرآن اکیڈمی آنا مشکل ہے تو انہوں نے حافظ صاحب سے کہا کہ آپ گھر ہی رہا کریں اور وہیں پر قلمی و تحقیقی کام کریں' ماہانہ حق الخدمت پیش کرتا رہوں گا۔ حافظ صاحب نے پیشکش قبول کر لی' آپ گھڑی دیکھ کر پورا وقت کام کرتے اور قلمی کام بروقت ڈاکٹر اسرار احمد کو پہنچاتے۔ حافظ احمد یار مرحوم کا انتقال ہوا تو ڈاکٹر اسرار اس طرح روئے جس طرح کوئی معصوم بچہ کھلونا گم ہو جانے پر احتجاجی گریہ کرتا ہے۔

وہ عموماً کہتے کہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ ہر ایک کو دیکھو' ہر ایک کو سن کر اپنی رائے قائم کرو۔ کسی کی بالکل نہ سننا اور اپنی رائے پر اصرار کرنا درست رویہ نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بھرپور زندگی گزاری اور بامقصد گزاری۔ وہ اپنے دور میں برپا ہونے والی مختلف تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کو قریب سے دیکھا' پرکھا' ان کے ساتھ چلے۔ جہاں ضمیر نے کچوکا دیا تو ساتھ بھی چھوڑا لیکن مقصدِ حیات سے کبھی غافل نہ رہے۔ انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو محرک اور متحرک دیکھا تو ان کا ساتھ دیا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ان کے ساتھ چلے۔ جب اپنے تئیں نتائج کے حصول میں کمی دیکھی تو اصلاح کی کوشش کی۔ جب اپنی کوششوں کو سراب ہی پایا تو راہیں جدا کر لیں۔

انسان کو بے مقصد دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔ قرآن کی آیت شاہد ہے: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ (المؤمنون:۱۱۵) ''کیا تم یہ خیال کیے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں بس یونہی پیدا کر دیا''۔ مراد یہ ہے کہ ہرگز نہیں' انسان کی تخلیق بامقصد ہے۔ جو انسان اس مقصدِ تخلیق کو سمجھے وہی اصلی انسان ہے۔ جو مقصدِ تخلیق سے غافل ہو کر زندگی گزارے وہ صرف سانس پورے کرتا ہے۔ ڈھور ڈنگر کی طرح چارہ کھاتا ہے' پیٹ بھرتا ہے اور دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھے' اس کو اپنا ہدف بنائے اور اس کے حصول کے لیے زندہ رہے۔ بعض لوگ شکم اور زیرِ شکم ہی کو زندگی سمجھتے ہیں' ایسے لوگ انسان نہیں ڈھور ڈنگر کہلاتے

ہیں۔قرآن کی شہادت موجود ہے:﴿اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹) ''یہ لوگ تو بس جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔''

ڈاکٹر اسرار احمد دنیا سے رخصت ہو گئے۔افسوس میڈیا والوں پر ہے جو پاتال تک کی ہونی انہونی کی خبر رکھتے ہیں لیکن انہیں ڈاکٹر اسرار احمد کی موت کا پتا نہ چلا' جنہوں نے ان کی عظمت کو پہچانا تک نہیں' نژادِ نو کو ان کی اہمیت وعظمت بتانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ان کی ساری توجہات شعیب اور ثانیہ کی شادی ہی پر مرکوز رہیں' حالانکہ شادی ایک نجی معاملہ ہے۔اس خالص نجی معاملہ میں غیر متعلق لوگوں کو شامل کرنا' نجی معاملہ کے مناظر کیمرے کی آنکھ سے لوگوں کی آنکھوں تک پہنچانا کون سی خدمت ہے؟ اس عمل پر تو حیا کی جبین پر بھی پسینہ آ جاتا ہے۔ہم نے یہی بات ایک دوست سے کہی' وہ بولے آپ کا خیال غلط ہے۔شعیب وثانیہ سٹار ہیں' شعیب لڑکا ہے' ٹوپی اوڑھ کر اور پتلون پہن کر کھیلتا ہے۔ثانیہ مرزا اپنی مرضی سے نیکر پہن کر کھیلتی ہے۔دونوں سٹار حق رکھتے ہیں کہ ان کی شادی کی لحہ بہ لحہ خبر اور تصویر سے لوگوں کو باخبر رکھا جائے۔میڈیا یہ حق ادا کر رہا ہے۔ہمارے نزدیک ایسے سٹارز عارضی ہوتے ہیں۔ان کی شوخی اور مستی اس وقت تک ہوتی ہے جب تک وہ میدان میں رہتے ہیں۔پھر ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟'' آج ایلن بارڈر اور لاک گنجے کو کون جانتا ہے' حالانکہ وہ بھی چالیس برس قبل کرکٹ کے ہی سٹار تھے۔ہمیں بھی لاک کا نام اس لیے یاد رہا کہ اس کے سر پر بال نہ تھے اور ہم سکول کے طالب علم اسے کھیلتا دیکھ کر مل کر کورس میں یہ گاتے تھے ع ''لاک گنجا' اس کے سر پر منجا''۔ اگر شعور میں یہ بات نہ ہوتی تو ہم بھی لاک کو بھول چکے ہوتے۔

اصل سٹارز تو ڈاکٹر اسرار جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جن کی زندگیاں گھڑیوں پر نہیں صدیوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔آج امام غزالی' فارابی' ابن سینا' شاہ ولی اللہ' ابن تیمیہ' جمال الدین افغانی' قاسم نانوتوی' داؤد غزنوی' عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم)' اقبال' غالب' قائداعظم کے تذکرے ہر جگہ ہوتے ہیں' حالانکہ ان کو دنیا سے رخصت ہوئے گھڑیاں نہیں صدیاں بیت چکی ہیں۔یہی لوگ قوم کا سرمایہ ہیں۔کاش! میڈیا والے اس بات کو سمجھ پاتے اور سرد مہری کا مظاہرہ نہ کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل سٹار ڈاکٹر اسرار جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے فکر کو آنے والی نسلوں کے دلوں میں مرتسم کر جاتے ہیں۔ان کی فکر مستقبل کو تابناک بناتی ہے۔لوگ ان کی جلائی ہوئی شمع سے مستقل روشنی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ڈاکٹر اسرار نے اپنی فکر کو زبان سے اذہان میں اتارا' قلم کے ذریعے کتابوں میں منتقل کیا۔کتابیں ہمیشہ رہتی ہیں' شمع کی مانند جگمگاتی ہیں۔لوگ ان سے' لوگ نہیں بلکہ نسلیں ان سے روشنی حاصل کرتی رہتی ہیں اور اپنی زندگیوں کو اُجالنے کا سامان مہیا کرتی ہیں۔لیکن میڈیا کو اس کا احساس نہیں کہ کتنا بڑا انسان دنیا سے رخصت ہو گیا اور دنیا والوں کے لیے کیا چھوڑ گیا۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر!

❁❁❁